

سالمہ محجہتے ہوئے کہا : "ادھر جا کر اپنی ماسی کو لے آؤ۔ دادو مر گیا ہے وہ اکیلی دہان کیا کرے گی ذمیے بھی جان کا خطرہ ہے۔"

لائیں میں تل کم خا اور وہ بھک بھک کر کے اچانک جبلِ اٹھتی تھی۔ گرمی زبانِ نکلا سکتے کی طرح مانپ رہی تھی۔ ہر بیلِ شکھ پر یہ رات عجیب تھی۔ اس کا شند شکوڑا جارہا تھا اور وہ خالی چھتے کی گزدی کی وجہ اور ادھر بکھرا جا رہا تھا۔ سارے گھر سے عجیب عجیب قسم کی آوازیں آرہی تھیں۔ بیویاں اپنے ساچیوں کو نہ پا کر رورہی تھیں۔ کواڑ رہ رہ کر چڑھاتے تھے اور یہ کوڑوں سے جھینگر دل کی صدیکیں آتی تھیں۔

بھری اور کرنیل ایک ہی تکنی پر سر کئے سورہی تھیں۔ آج کرنیل کا بازوں بھری کے سرتلے تھا۔ بھری کی رنگت آج بھی ملکتے ہوئے چڑھتے کی طرح بچنی تھی۔ درفت بالوں میں سفید بال آگئے تھے۔ ناک میں وہی آبدر کو کا تھا۔ اور کانوں کی ڈنڈیاں بالوں میں بھنسی ہوئی تھیں۔ اس کا جسم وقت کے مانہ بھاری ہو گیا تھا۔ لیکن یہ موٹا پاخوں صورت تھا۔ لایکی تھویر وہ میں بیٹھت کی ہوئی سورتوں کی طرح شناوب مولدا اور توجہ طلب۔

ہر بیلِ شکھ لکڑی کی چھوٹی سی ریڑھ پر بیٹھا تھا ہی دری بھری کو دیکھتا رہا۔ وہ اس کی بباب پُشت کے کر لئے کا گھڑا آٹا۔ دھرے بے مدد سورہی تھی۔ اگر ہر بیلِ شکھ چاہت تو کہا رہ بھر کے بھری کو اندر حوالی میں رے جا سکتا تھا۔ پرانے کمروں میں اس کی آواز پھچپنڈر کی آواز بن جاتی۔

ہر بیلِ شکھ اسی خیال کے تحت اسے حوالی میں لا یا بھی تھا۔ لیکن خدا جانے کیا بات تھی کہ وہ وہ کڑا ہوا تھا جیسے کھڑی کی منځ خونکی ہوئی ہو۔

آج اسے رورہ کر دا دیا دارہ تھا۔ دھونی تی جیسی رنگت والا دادو۔ گھٹے کی آنکھوں پر پوپٹ جانے کو لوکے پیڑ پر چکر لگتا۔ پی میں تل کے چھچھے گاہوں کے ساتھ بھکرتا۔ دی نماہوں نی جس سے وہ وقت بے وقت کو لمبی موری کھولا کر تھا۔ اسی چوبی دستے سے کبھی کبھی وہ بھری کی توانش بھی فرازیتا تھا۔ اٹے پہنیٹ پیٹھے اس کا اونگنا اور لاث کے توازن بگٹنے پر بدک کراٹھا اور لال ددا

سے ریکھا ہر فی آنکھیں مل کر بھری کو آناز دینا۔ تیل والنس میں انگلی ڈب بود بوكر تیل پچھھنا اور پھر جھوٹی انگلی کو بغیر بالوں والی چھاتی پر مل کر طکار لینہ اور چہلپکی تسلن سے ماش کرتا ہوا داد مہولی مکھاڑ پر پھلنے والے ایک لگھ سے بھی بے فرشتی نے سوڈھیوں کے مردار کو پچھاڑ دیا تھا۔ آج اسے یوں لگ رہا تھا جیسے داد و ساری عمر تیل کے کنتر اپنے گھر جمع کر تالا اور پھوک پھوک اس کے گھر پھیکتا رہا۔ لال دہ آنکھوں میں ڈلنے والے اس ادمی سے پہلہ لینا ضروری تھا۔ لیکن ابھی تکمہ ہر زیل وہ طریقہ نہ سوچ سکا تھا جس سے داد کو گھان پکھ کو لوکیا جاسکتا۔

ابھی وہ فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ جستی پچھلک کی جو لیں آہستہ سے کر کرائیں اور کسی نے کندے پر یا ناقہ دکھ کر اندر کی طرف دیکھا۔ ہر بیل ملکہ کے تدابھری کی چار پانی سے مرکر ٹرڈھی کی طرف چلنے لگے۔  
”کون ہے؟“ اس نے اندر والے قغل میں چابی ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”اہم ہیں تر۔“

آواز جانی پہچانی تھی۔ ہر زیل نے دعا زندگوں دیا تو باہر چاند کی نشانی میں کرپانی ہی کرپانی نظر آئی۔

”یہاں تیر سے پاس کوئی مسلمان شرک لینے آیا ہے ہر بیل سنگھو؟“ ایک جنادھاری سکھ نے اس سے پوچھا۔

ہر بیل نے باہر نکل کر پس پیچھے آہستہ سے چاہک بند کر دیا۔ یہ ساری صورتیں جانی پہچانی چکنے ان میں زیادہ لوگ وہ تھے جن کے ساتھ کراس نے کئی پربند حکم پڑا۔ یا بنائی تھیں مسلمانوں سے جہاد مانا کو پاک کرنے کی قسم کھائی تھی۔ اس کے سامنے اسی کے کور دبعلان نصیب چاہک ہوئے تھے اور ما جراحت بن کی طرح وہ پانڈوؤں کی رتھی میں بیٹھا راز را تھا اور سوچ رہا تھا کہ اپنؤں پر کیونکر دار کیا جا سکتے؟

”بول ہر بیل سنگھا اہم نے قسم کھائی ہے کہ ان مسلموں کو نہ اپنے گھوڑیں میں رہنے دیں گے نہ پرائیو کے گھر شرک لینے دیں گے۔“ بول!

ہر زیل نے نفی میں سر ٹاپایا۔

”ہم تیرے گھر کی تلاشی میں گے، ہر بیل سیاں۔“ جنہوں بھی ششک دار ہی والا کہنہ سال بولا۔  
نیز ایک سو ڈنی سردار کا گھر ہے۔ اس گھر کی تلاشی میری ہوت کے بعد ہو گی۔ تمارے نے میرا  
پہنچ کافی ہے۔“ ہر بیل غرزاں۔

”اب ہم آزاد ہیں۔ جو چاہیں گے کریں گے۔“  
”بھارت کے علاقے میں ایک سکھ کے گھر کی تلاشی ہو گی۔ لعنت ہے ایسی آزادی پر۔“  
”تیرے گھر میں مسلمان چھپے ہیں اور ہم نے موگنڈ کھلانا ہے۔“

”میں نے بھی ایک سو گنڈ کھافی ہے جو گندر سیاں۔“ ہر بیل چینا۔

”راستہ چھوڑ دے ہر بیل شکوہ۔“

”سو ڈنی سردار راستہ نہیں چھوڑا کرتے۔ لہستے ان کے لئے چھوڑ دے جلتے ہیں۔“  
ہر بیل نے رٹنے کے لئے کمروڑی تو لے کوئی خندی سیا چیز پشت پر اندر کی ٹلف صنتی ہوئی  
محسوں ہوئی۔ کہ پان کا پھل اتنا یہ تھا کہ جس وقت تو گندر سنگھنے اس پر دار کیا اس وقت لے مجھ  
کے لئے بھی شکر مگر زماختا کہ وہ موت سے اس ندہ فربہ ہے۔ تو رکر گرا تو کشمیری ڈونگے جیسی پیگڑی  
پسلے پچاہک سے نکلائی اور پھر بھول کی طرح پتی پتی بکھر گئی۔

”یقونے کیا کیا موڑ کھ۔“ چھپے آزاد آئی۔

”لپٹے پنحوت کے ادمی کو مار دیا۔“ کہنہ سال سکھ بولا۔

”سو ڈھیوں کا پتہ نہیں تھے۔ ایک کوتا مار تو لا کھول اکٹھے ہو جلتے ہیں۔“

”ویکھتے کیا ہو۔ مرنے کی اصلاح ہے اب تباہ گا چلو۔“ راستہ لو۔ تباہ۔ دھمکہ منثور میں

نابت ہو گیا۔

جب بھری اور کرنیل کو حصتی پچاہک تک پہنچنے تو ایک بھی سورکھ باہر موجود نہ تھا۔ ہر بیل کی ساری  
رک رک رک رہی تھی اور ہر سانس کے ساتھ اس کے ساتھ سے اور کی دھار نکلتی تھی۔ بھری کے دو پیٹ پر  
جاتا ہوا کے دھستے تھے۔ اسی طرح جب کرنیل کو کچوٹ لگائی تھی تو اس کا دو پیٹ اس سے بھیگ گیا تھا لیکن

اسے اس سے مگن نہیں آئی تھی۔

تو باتیں سن کر ہر زیل سکھو۔ آرام سے سوجا۔

اب تو سوہی جانہ ہے بھری۔ کم از کم باتیں تو کر لینے دے۔

بھری نے منہ پرے کر دیا اور آہستہ آہستہ ہر زیل کا بازدہ بانے لگی۔

میرے پاس تجھے دینے کیلئے کچھ نہیں ہے بھری۔ یہ کرنیں کو رہے اسے ساتھ لے جانا۔

..... لیکن۔

یہاں نہ مسمیٰ رہنا میرے بعد۔ اپنے لہک چلی جانا۔ اور کرنیں کو ساتھ رکھنا۔

بھری نے بات کٹ کر آہستہ سے کہا: پر یہ تو... میں اسے کہاں بیا ہوں گی، ہر زیل سکھو۔

دوڑھی سردار کماں تیاش کروں گی اس کے لئے:

کسی اپنے سے کسی آدمی سے بیاہ دینا۔ یہاں اس کا کوئی نہیں ہے۔

تو عیک ہو جائے گا ہر زیل۔ عیک ہو جائے گا۔ پھر لے کسی ہوڑھی سردار سے بیاہ دینا۔

جو گندہ سکھ کی کرپاں کا زخم کبھی عیک نہیں ہوتا بھری۔

ہر زیل یعنی ناکیں آہستہ آہستہ کا پر رہی تھیں اور وہ پڑی پر ہو لے ہو لے ہاتھار ساختا۔

بھری نے منہ پرے کر دیا اور سورہ لیں پڑھنے لگی۔

اوٹے تو اپنی اسی کے ساتھ چلی جانا درش کو۔ اب یہاں تیرا کوئی نہیں ہے۔ یہ بھی جانتی ہے۔ کسی اچھی جگہ تیرا بیاہ کر دے گی۔

آخری بار بھری نے ہر زیل کی آنکھوں کا حسن دیکھا۔

بن تیلکی، تی بچک سے جل اور جھنپ بھگدی۔

پاکستان پہنچ کر بھری نے بست کوشش کی کرنیں کی شادی کسی اچھے گھر از میں ہو جائے لکھنیں

جمال بھی پیام کے رجاں لوگ کرنیں کی پچھلی ہڑتی من کر خنوش ہو جاتے کبھی کوئی اندر ہنی نہیں تو کسی کوئی۔

بست بر کوں بعد جب بھری نے داد کے چھیرے بھائی سے کرنیں کو رکا علاج کیا۔ اس روز شبِ معراج

پھر فوٹ کرتی۔

کرنیل اتھل میں مندی لگائے چب چاپ بیٹھی تھی۔ اسی کی ساری کے منہ پر پھول امک کے داغ تھے اور رنگ زنجن پاچھی سے بھی سیاہ تھا۔

شبِ معراج ہوئے ہوئے گزرہ بی تھی اور کرنیل کے اتھل کی مندی مسکو کو کہ کہ بھر بھری ہو گئی تھی۔ پھر وچھلے پڑائی کی ساری نبفری کو جگایا اور آہستہ سے کہا: ”تو ہمیں سچ کیوں نہیں بتائیں اس بڑکی کے اس باپ کون ہیں؟“

”میں ہی اس کی ماں ہوں اور میں ہی اس کا باپ ہوں۔“

ذیکر اگر تواب نہیں بتائے گی تو بعدیں پچھلتے گی۔

بھری ناخود جوڑ کر بیٹھ گئی اور آہستہ آہستہ بولی — ”ben۔ اس کے تھکے بیکھیں۔ لیکن خدا جانشی کے کرنیل کو بھیر کی مسلمان ہے۔ اس کا دل پکپین سے مومن تھا۔“

”اگر کسی کو گاڈن میں پتہ چل گیا کہ یہ سکھل کی بیٹھے تو میری پہنیا نایلوں میں ہو گی۔“

”نہیں ہن۔ عذر راسکھ نہیں ہے۔ مسلمان ہے۔ نماز پڑھتی ہے۔ روزہ رکھتی ہے۔ اس کا تو پکپین سے بھی حال ہے۔ دینداروں کی بیٹھی ہے۔“

”لئے لئے ہن۔ خدا کا خوف۔ نو مسلم کا شرستہ میرے بیٹھے کئے ہی رہ گیا تھا۔ ہمارے دیکھ کوئی مسلمان روکی کا شرستہ نہیں بل ملتا تھا۔“

آپ بھلی بار کرنیل کو پتہ چلا کہ بھری اس کا شرستہ کیوں نہیں کر سکتی تھی۔

کرنیل کی آنکھیں سے ہوئے آنونکل کرائی کے مندی گئے اتھوں میں چذب ہونے کے پھر کسے لگا بڑی جویلی کے لگنڈوں پر سے انگیر کے درخت کی دُایاں زین کی طرف چلیں۔ ایک پتہ ان ڈایلوں سے پھر کر فرش پہ جاگا۔

اس پتے پر ہر بیل ملکوں کا نام لکھا تھا۔

ہر بیل ملکوں کا نام کیا ہے؟

کیا میں پاکستان میں کبھی اسی کا ذکر کسی سے نہ کر سکوں گی؟ — کیا عذر لائیم بن کر میرے دل سے ہر بیل سُکھ کی ساری محبت دھل پچھی ہے؟ — کیا ہر یہیں سُکھ کا نام میرے سوال میں گانی صحابت میں لگا؟

عمر میں بھی آرہی تھیں، چار پانیاں ہنکوں سے رہی تھیں اور کرنلی کے ہونٹ بغیر ملے کمر رہے تھے۔ یا رسول اللہؐ! تیرے در پر آئے ہوتے لوگوں کے لئے تیرے پیار دل نے دردازے کیوں بند کر کے پیں — مجھے اس بات کا رجع نہیں کہ سو ڈھی مردانوں کی اڑکی ٹیکی کے ساتھ یا ہی جا رہی ہے۔ میں تجدید سے پوچھتی ہوں کتنے رسول میں ایک نو مسلم مسلمان ہو جاتا ہے۔ کتنے رسول میں؟ کتنے رسول میں ٹیکی ہر قشیر نہ رہ پہنچنے والے، اکلمہ پڑھنے کے بعد مسلمان کہلانے کے لئے، کتنے رسول اٹھلے میں رہنا پڑتا ہے؟

کتنے سال؟ کتنے سوال؟ — اور ہر مسلمان ہو جانے پر کب اور کس طرح وہ تیرے دردازے پر دشک دینے والا پر تیرا، ہی درعازہ بند کر دیتا ہے؟ — تغلیخونے اور دوسروں پر تغلیخ کرنے کا کتنی مزدیسیں ہیں رسول اللہؐ — عرب سے عجم، عجم سے پاکستان، پاکستان سے بگال، بگال سے انہو نیشا...، کماں کماں درعازے کھٹکھٹلئے گئے اوس بند پائے گئے۔ اندر گھس جانے والے باہر واول پر ظلم کب تک روا کھین گے۔ ظلم سنتے اور ظلم کرنے کی روایت کب تک رہے گی۔ کتنے سال؟

کتنے سوال؟ —



# سامان

اہنوسی فرش پر نو عمر کنوواری کے گیلے پیروں کے  
جب جون کے میسے کی گرم ہوا انسیں بوسہ دیے  
جذب ہو جائیں گے — اور بیاہ فرش پر سے الہ  
اپا و جود کھود دیتا ہے۔ پھر گیلے پیروں کا نشان جون کا  
درختوں میں نکل جائے گا اور کسی کو پتہ نہ چلے گا کہ ہر سیا  
ہوا کرتے ہیں۔

میری ساری عمر ایسے ہی نتناوں کے تعاقب  
حالیں بدلتے دیکھا ہے۔ خوس سے اائع اور مالع سے  
ہے اہ اس پر یادوں کے نشان بہت جلد مکوم بوسوں  
میرے کمرے کے سامنے ایک اونچا پیل کا پہ  
چیل کا گھونسلہ نظر آیا کرتا تھا۔ اس گھونسلے میں انڈہ  
چپ چاپ بیٹھی رہتی تھی دمچے اس چیل پر بہت  
زرد فانوس روشنگروں سے کوئی ادازہ آتی۔ مرد مشر  
بلند کرتا تو مجھے ایک لندہ یا شر کی مسلسل گھرے خوف

## شیلوں

کے نشان ہیں۔

خشن کے لئے جھکے گی تو یہ نشان خود بخود اسی بو سے میں  
ن کا نشان مٹ جائے گا۔ لمع گیس بیکر  
سکوم بوسہ بن کر سیاہ فرش پر آں بیساٹاً المتساکے  
ہ فرش پر کسی نہ کسی نو علماً کسواری کے پرڈوں کے نشان

میں گزری ہے — میں نے مادد کو پنے سامنے  
کے گیس — میری زندگی کا سیاہ فرش بہت چکنا  
کاشکار ہو جاتے میں۔

ڈیڑھا۔ بگر میوں میں اس کی ساری چھنٹ پر ایک  
بیسنے والی چیل جون کی دھوپ میں میری طرح تھا  
ترس آنا تھا۔ بھری دوپہر میں مجھے المتساکے  
کو اور ڈر کی جانب سے کوئی شوخ بچہ چیز کی عدا  
آئے لگتا۔ شھنڈے کرے میں ابھی ہوئی امیر فرشز کی

خوبصورت اون کی طرح ناک میں لگھنے لگتی۔ پھر کیم میراسانش بند ہونے لگتا۔ میں مولیں کرتا کھو دیں میں پڑھ بیٹھا اور پردے کی بھرپور سے باہر دیکھنے لگتا۔ باہر در در دو تک تلبے کی طرح چلکتی رہنی ہوتی اور دیواروں سے پڑھیوں سے روشنیوں کا ایسا ہستہ ہوا پانی نظر آتا جیسا کہم سڑک پر دردے ایک آپنی ساراب بن جایا کرتا ہے۔

امی ابو کا یہ کہہ جس میں تین ان کا گور تھا فراز نیسی وضع کا بیڈ رو تھا۔ دیواروں کی جلد صاحب دوں کے نوزہ میں بیچے کی طرح صاف ملامت اور بیدائغ تھی۔ سارا فراز نیسی فریچ پر مدد تھا۔ امی کی اماریاں ڈریاں۔ شبل اشتن، چشت آف ڈر اس سب سفید تھجھن کی جلیتیں قیمت فارما تھکا کی تھی۔ چاپن لگتے ہی اماریوں میں ہوئے ہوئے گھنیاں بیکھنے لگتیں جیسے لگو کی ٹھڑلوں میں عوام بجا کرتی ہیں۔ مکرے میں بہ طرف سفید پر دے تھے۔ ابرتھی، آپ روانے سے بے خود پر دے۔ اسی سفید کرے میں میری سفید ماں آرٹش لینن کی چادر پر سفید پلاٹر اف پریس لکھنے ہوئے ٹھنڈے ایک دوسرے پر دھرے گھنٹوں لیٹی رہتی۔

میری ماں بڑی نازک عورت تھی۔ اس ادمی کے سفید گلاب کی طرح گرم اور دے بنے نیاز وہ ارماں دز بیانش اور نماں دز بیانش کرنے بنی تھی۔ کسی قسم کی ارماں سے اس کاقطعاً کوئی تعلق نہ تھا۔ میری پیدائش کے بعد اس کا نازک جسم پھر کبھی بالا اور ہونے کا حوصلہ نہ کر سکا۔ وہ مجھ سے بنے پناہ جلت کرتی تھی لیکن اس محبت کا انہمار ہمیشہ تحفے تک محدود رہا۔ وہ نکسی کو بھی پیچ کر سینے سے لگا سکتی تھی اور نہ ہی کسی کی والہانہ گرفت کی تھی ہو سکتی تھی۔ میری ماں کو اس انی جسم کی خوبصورتے لفڑت تھی لے مجھ سے بُو آتی تھی۔ ملازموں سے بُو آتی تھی۔ اسے میرے گنجے باپ سے بُو آتی تھی۔ وہ سارا دن اپنے جسم پر اپنے کمروں میں اپنے لہزوں پر بُو ی خوبصورتی رہتی۔ میری ماں نے جب کبھی کسی کے لامہ لیا اپنے نفعہ رہمال سے (جس پلاس کے نام) کا پلا حرف انگریزی میں کشیدہ کیا ہوتا۔ بعد میں اپنا ہاتھ فردر پر کھپا۔

میری اس جس کرے میں داخل ہوتی اس کا پلا سانش انسانی ہاتھ کی طرح محبوس کرتا لفڑتا۔ وہ اس

سانس میں کمرے کے تھن، اس کے رہنے والوں کی خوش ذوق کا اندازہ لگایا کرتی تھی۔ اس لیڈی آن شیلاد، اس ناٹ ہاؤس کے سفید گلاب، اس پل سڑک پر ہم کی بیٹھ دنے اپنی محبت کی شدت میں مجھے اس طرح پالا جیسے کسی سراپ کے خوف سے کوئی راجح کینا اپنا پکے کسی مٹھیں پال رہی ہو۔ مجھے سکول جانے کی اجازت نہ تھی میرے تالیق گھر پر آکر مجھے پڑھاتے تھے۔

مزدش کوارٹ کی طرف قدم دھننا تو درکارا دھر دیکھنے کی بھی مانع نہ تھی۔ اس طرح نیلے لوپنامی سیاہ لونکی پرچاٹیں پہنچانے کا حفظہ تھا۔ ہمارے رشتہ داروں سے ماں کبھی کی کٹ چکی تھی مدد اب ایسے سو شل سرکل میں رہتی تھی جہاں سب روز روشنے ہیں لیکن کوئی مکسی کو نہیں جانا۔ میری ماں کے ووگر دغیرے ضروری معروفیات کا ایسا جاہل پھیلا تھا جیسے کہنی الیر کی بات کو امبریل نے دھاپ رکھا ہو۔ وہ فرست کے لمحوں میں بیمار رہتی اور غیر ضروری مشاغل کے وقت چاق و چوبنڈ۔ میری ماں ان عذرتوں سے تھی جب نیں عرب بدروی اتنا نہ کہتے ہیں۔ مکروری اور بیماری کے بدلے انہیں ایک ایسی خود فریتی میں مبتدا کہتے ہیں کہ وہ نہ اپنے نہ کسی دوسرے کے کام کی رہتی ہیں۔

ابو گنج تھے۔ خاموش طبع اور دلِ محنہ۔ ہر دن کے ساتھ ساتھ ان کے گنجے پن، خاموشی اور دو میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ سردوں کی بھی شاموں میں وہ کم بھی بھی میرے کے میں آکر بیٹھ جاتے۔ ابکے ہاتھ میں سہیشہ ان کا بر لیف کیس ہوتا۔ اس بر لیف کیس کے کئی خانے تھے اور ہر خانے میں ضروری کاغذ اور اہم چیزوں کی موجود ہوتیں۔ ان کا سریر ورنی مالک سے آئے ہوئے خلقوں پر جگ جانا اور وہ خاموشی سے خط پڑھتے رہتے اور جب خط ختم ہو جاتے تو وہ خاموشی سے اٹھ کر چلے جاتے۔ میں اپنے ان کھلوڑوں کے ابزار میں سے ایسیں دیکھتا رہتا جس سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ خدا جانے کیوں میرا جی چاہتا کہ میں اٹھ کر ابو کے چکنے چکلتے۔ فر پر ہونٹ رکھ دوں لیکن ان کے خاموش چہرے کو دیکھ کر مجھے عجیب ساخت آتا۔

سردوں کی طویل راتوں میں جب میرے کرے میں سرخ، میٹھے اور گرم پانی کی بوتل میرے پر دوں کو چھوٹی، بستر میں سے یونڈ کے پھولوں کی خوبی کا قی اور پر دوں کی رمنائی پر میری کام کی کتابیں بکھری ہوئیں۔

ایسی راتوں میں جب اچانک کھرمنگی پر راستے کے وقت بھی کی چکتے سے چانچ ہر جا آتا میں جاگ اٹھتا۔ میلوں کی بادشاہی کھڑکیوں پر بھتی۔ گرم پانی کی بوئی صندھی ہو کر قالین پر ڈھنک جاتی اور میں جاگتا رہتا اور سوچتا رہتا۔ بھارا درخزان کے دن تلیوں اور چھپوں کی وجہ سے تکلیف دہتے۔ یہ دونوں بھیزیں مجھے بہت پسند تھیں اور ان دونوں سے میں بہت خوفزدہ تھا۔ ایک دفعہ میں نے ایک زرد ننگ کی تتنی پکڑ کر ایک گھاس کے پیچے بند کر دی۔ اس کا دل بدلنے کیلئے میں نے دو پار گھمیں چھول بھی ساتھ مقدمہ کر دیئے یوں زرد تتنی کو بھوپی کر کے بچھے عجیب راحتتی محسوس ہوئی۔ لیکن جب میں دوپہر کا ہانا کھا کر لوٹا تو وہ تتنی چھپوں کی قبر میں پہلو کے بل پڑی تھی۔ میں نے اسے پانی پلا کر زندہ کرنا چاہا تو اس کے پر دل کا زرد براہہ میری انگلیوں پر اتر آیا۔ اس کے خوش رنگ پر زندہ ہے لیکن وہ خود مر گئی۔ تنانی کی موت!

میرے یہ چھوٹے چھوٹے تجربے جن کا تعلق روح اور ذہن سے ہے بت گھر اتحا بچھ پر در پا اثرات چھوڑتے۔ میں گناہ اور ثواب کے چکر میں دور ہمک اتنا صنس گیا تھا کہ تتنی کے یوں اچانک مرحانے کو میں نے دو زخم میں گھر پہنچ کے مترادف گھما اور دونوں نکل پڑا۔ شستی کے طور پر بھجو کارنا — یہ بیکار دن — یہ بیکار راتیں — یہ آسانش کے پانے میں چاہنے کا چچے منز میں لئے سان ہی جلد والی چھت کو تکنے والا بیکے عجیب کرب کی منز لیں طے کر رہا تھا۔ لیکن سب سے زیادہ تکلیف وہ ٹوکریوں کی لمبی دوپہر میں ہیں۔ ایک کنڈہ رینڈ کمرے میں ایک ایمن پچھے کی گرمیوں کی سر دوپہر میں!

امی پا سڑاٹ پیریں کے بنے ہوئے تھے آپس میں جوٹے کی جا سوئی ناول کو بڑھتی موجوداتیں اور میں نشناک کر چھوڑ کر پیچی چھت دل کے گرم کمروں میں گھومتا رہتا۔ سارے کرے کیساں طور پر اگر استاد گھر ہوتے تھے۔ ان پیچی چھت دل کے کروں میں قالینزوں کی گرم ممک پر دوں کے اندر مجبوس ہوا کرتی تھی پھر ان کمروں کو چھوڑ کر میں اپنے کرے کے سامنے چھوٹے سے لاڈنے میں آ جاتا تھا۔ بیرونی دیوار ساری شیشے کی تھی۔ اس جگہ سے چیل کا گھونڈا بڑی اچھی طرح نظر آتا تھا۔

ایک بار اس گھونڈا کو خوبصورت بنتنے کے لئے چیل کمیں سے میری ای کی جالیدار ہم اڑالانی تھی۔ پیلی پیلی آنکھی پھنگ پر رخت تکنوں کے گھونڈ کے ساتھ فراشی میں کی امگیا! اگر کسی اشتباہ

ویسے والی ایک شخصی کو پتہ چل جاتا تھا وہ اس گھونٹے کا کلوڑا پے حزور یتے۔ گھونٹے میں سمجھی ہوئی فرانسیسی میٹرین جیسی چیل عقابی ناک اور پر شکوہ پر سنیٹی اور سنپے رقم ہوتا۔ بگری ہو یا مردی ہر باذن خاتون کے لئے — ہر موسم میں۔

میں اسی گھونٹے کو دیکھتا رہتا اور الہام کے زرد فانوسوں میں سیاہ کوٹ بار بار کوکتی رہتی۔

ٹوب دل کے چلنے کی آواز آتی رہتی

کوارڈوں میں بکپے پیسے بکلتے رہتے۔

گھونڈا دیکھنے کے بعد میں جب کبھی کرس کے اندر دیکھتا تو میری آنکھوں کے آگے ایسے شعلہ ٹھٹھے جیسے کرے میں دیکھنے کو ہو رہی ہو۔ پھر میری مکروہ اور بیماری کی آنکھ کھل جاتی۔ وہ اٹھ کر رخنے سے روپا سے منزہ مان کرتیں۔ ایسا ہاؤں کوٹ پہنچتیں جس میں سے سارے پیڑے اور بھی دانہ خطرد پر نظر کرتے۔ اپنے کئے ہوئے بالوں کو زور دا دیوار انقلابوں سے سوارتی ہوئی وہ تماش کرنے لگتیں۔

گرم کر دیں میں محبوس گئی فضنا میں سانس لیتے ہو کرے کی خوشبو کا انترا ماہمازہ لینے ہوئے مجھے ملک پہنچتیں۔

ای کے مجھے کبھی نہیں جھوٹ کا۔

ابو محمد پر کبھی ناراضی نہیں ہوئے۔

ہم تینوں کو ایک دوسرے کی محبت پر اس قدراً عتما نہیں تھا کہ ہم اپنے دل کی بات کو الفاظ میں فحال سکتے۔

امی کو دیکھ کر میں چپ چاپ ان کے ساتھ رخصعت ہو جاتا اور خاموشی کے ساتھ ٹھنڈتے کرے میں پنگ پر لیٹ جاتا۔ پھر تھوڑی دیر بعد میری ناک بند ہو جاتی اور ارجس سے میلائش بند ہونے لگتا۔

امی ابوکی ہرام بات انگریزی میں ہوا کرتی تھی۔ جس طرح رخنخ مر خشور کا مارکٹنگی میں گئی

نکال لیتے ہیں اور چھلکا رہنے دیتے ہیں۔ اسی طرح ان کی گفتگو کا سارا مفہوم میں چک لیتا اور پوچھ رہنے دیتا۔

میں اس سفید کوٹھی میں اس طرح پل را تھا جیسے کسی بستال کے انکھوں پر سیسر میں ستوانہ پہ دن کاٹ رہا ہوا۔ ایسی زندگی نے مجھے بہت نازک مزاج بنادیا۔ ہر مرسم کی تبدیلی میری صحت پر اثر آیا۔ ہوتی۔ میری فدا خامس اہتمام سے تیار ہوتی اس میں ذرا سارہ وبدل صحت کی خرابی کا بہانہ بن جاتا۔ بیماریوں کے خلاف قوتِ مدافعت پیدا کرنے کے لئے مجھے اتنی نیکی گئی کہ اپنے کر جان بیٹھے لپٹن کر لئے۔ ٹیکل کی شاذ ہی ضرورت پڑتی ہو گئی۔ ہمارے گھر کا مالا نظاہم گھری اور خوف کے تحت چلتا تھا چور دو کا خوف۔ بیماری کا خوف۔ بڑھاپے کا خوف۔ مارڈوں کا خوف۔ اخبار پڑھ کر اپنے حدوڑوں کا خوف۔ بالآخر اسیں چور کر مرنے کا خوف! تماً غیر ضروری مشاغل گھری کے تباہ سے تھے۔ ہر غیر اسلام کھری دیکھ کر کیا جاتا تھا۔ یہاں ڈر زے اوت آنے کی جلدی تھی۔ صحیح الامر رکھ کر اسجا جاتا تھا۔ اور بھرالا رگ بند کر کے یمند کی جاتی تھی۔ ملازموں کو مقررہ وقت پر ہاشم رکنے کا حکم تھا اور ناشتہ کی جگہ صرف گریب فروٹ کھایا جاتا تھا۔ ہر بار اس اہتمام سے پہنا جانا تھا اور اہتمام سے پہنچنے کے بعد اسے اتار پھیلنے کی جلدی رہتی تھی۔ ہمارت گھر میں وقت کی سونے کی طرح تدری کی جاتی تھی اور سونے کی قدر اس لئے منظم ہو چکی تھی کیونکہ یہ یا اس کا گھر تھا اسی میں جس چیز کو ہاتھ لگاؤ کھٹے سے سونے کی بن جاتی تھی۔

اکیلی چیلے سے متاثر ہو کر ایک بار میں نے ملی پانچاہی بخوبی سی سفیدی۔ وہ بھیجنی کی گلبی ناک والی بُنی خدا جانے کیونکہ ہمارے گھر آگئی تھی۔ شاید اسے چیلے نے بھیجا تھا۔ جو بھری دوپر میں عجائب آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہتی تھی۔ گچھے دار دم والی بخوبی سی سفیدی تی بڑی پتوڑی اور بڑی کھلنڈری تھی۔ پر دوں اپنی دم کے ساتھ کھلیتی رہتی۔ گلبی زبان سے اپنے تنجھیاٹی رنگ پر مٹی گئی جاتی تو پر دوں اپنائیں زبان سے دھوتی۔ اس بُنی کو میں نے اپنی زندگی میں داخل کر لینا چاہا لیکن میری امی نے اس بات کی اجازت نہ دی کیونکہ انہیں جانوروں کے باول سے پرندوں کے پر دوں سے اور چڑیوں کے گھنڈوں سے ارجی تھی۔ ایسی کوئی چیز کوٹھی کے احاطے میں ہوتی تو انہیں چھینکیں آئے لگتیں اور دوہما رپڑ جاتیں۔ جس روز بخوبی سی سفیدی کو بُری میں بند کر کے پر کیدار روانہ ہوا میں سورا تھا۔

لکھن اگر میں جاگ بھی جاتا تو میرا زدیں دیں وہی ہو گا۔

پسند گئے باپ کی طرح میں بہت خاموش ہوں

مر پر انوکھے مرکبات لئتے ہئے کے باوجود ان کے گنجے پن میں دن بدن اضافہ ہوتا رہا۔  
ذہانت کی کمی کے باوصاف ان کی دوست گوند ق کے پریڈکی طرح لمبی تکلیفی چلی گئی۔

میرا باپ بہت شفقتی تھا۔ وہ جس کی لہک میں جاتا ہیرے اور اسی کے نئے وہاں کی نہشی ترین سونعتیں

لائتا۔ میرے باپ کے سوٹ کیس پر ان گفت اپنے فریڈی کی پر جیسا چیکی ہوتی تھیں سوہ روایہ، بلخاریہ، بھیجی

پولینڈ، روسی ترکت ان کی باقی میں اس طرح کرتا تھا جیسے کوئی بوری بازار، بولشن ماگیٹ یا انارکلی کی بات

کرو رہا ہو۔

اس ماحول سے نکل کر رہ بی میں باسٹر سکول میں پہنچا تو میں نے پنارڈ گرداکی ایسا حصہ ہا را موقوف

تعیر کر دیا تاکہ ہم جماعت تو درکنداشت دیکھ جس سے اہم حلقہ رہنے میں عاقبت صحیح تھے تک مکول میں

مجھے کوئی ہم سطح لڑکا نہ ہوا۔ کچھ تینجا کا کوئی نہیں مار رہے تھے۔ دو چار لڑکوں نے محبت کے برے بڑا کر

یرے مل کی فصیل میں سوراخ کرنا پڑے۔ سوراخ ہو چکی گئے۔ فصیل ٹوٹ چی گئی لیکن ان لڑکوں کو علم نہ ہوا

یہونکہ میں اپنے باپ کی طرف خاموش تھا۔

خداحلانے اسلی وہی کیا تھی لیکن جب میری ابی ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق منی کے وسط میں مرنی

چلی گئیں تو پہلی بار میں نے کھلی خفا میں سانس یہاں دلوں میں نویں جماعت میں پڑھنا تھا اور پہلے ارامی

سے سچھا تھا۔

ہمارے کھوئیں جہاں ہر طرف، دُتوڑا ش ڈیلو ڈرست اور اپنے فرشتر کی خوشبو تھی، ایک تازہ ہوا کا

تمبوٹا آیا۔

چاہکے، بل تکلف اور اڑا کا نہ۔

یہ پھاڑوں کی براں گھلو تھی۔

بزار سے کیا یہ لڑکی چیکی کی طرح تکلیف دد بے تکلف اور مزید اترتی۔ اس کا، تینگر گلوبن کی آئنک

ٹانگ کا محاجہ نہ تھا۔ ہر وقت تحال سا پر گورنمنٹ کے چھوپل کی ٹھرت سرخ رہتا۔ چہرے میرے کے سب سے کمیں لگتی تھی جسم دیکھ کر کا سستھ رکھ کیاں یاد آتیں جن کی بجا فیتنام جسی اور ارہیڑہ صبلے جھولے ہوا کرنی ہے۔ چال دھال میں کنجah کی جاشنی تھی۔ باتیں کرتی تو سونی ہوئی لگتی تھی۔ چپ ہو جاتی تو یوں نکلا بولے جا رہی ہے۔

میرا جو دن دنوں تھرمونی سے مشابہ تھا۔ ایک بار جو بھی جذبہ اندر ڈال کر کارک لگایتا تو یہ تک اس جذبہ کی حمت و حرارت دیسے ہے اور قرار رہتی میں تھرمونی میں سب سے پہلے میں نے گلوکو قرب سے دیکھنے کی خواہش کا گرم گرم لاوا بنڈ کر لیا۔

گلوکو بیرے جہاندار خان کی بہن تھی اور ایک ماہ کے لئے جب بہانہ مارکی ٹانگ پلٹز میں تھی براہ کمی پر مامور ہوئی تھی۔

خاباً اس سے زیادہ اُجھا گنوار اور بنے تیز بیل پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔

پہلے ہی دن جب وہ میر پر غلط سلط بر قریب رکھا کر سوپ لائی نور کھنے کھانے میں اس نے اکھا سبب

لپٹنے اور میرے اوپر اندھیلی یا۔

میر سے شے یہ باکل انوکھا بخوبی تھا۔ سوپ کبھی گر جی سکتا ہے میں اس کے لئے تیار نہ تھا۔ میں نے اسی سرویٹ ٹھک بانچ دیا ہی تھا کہ وہ لپٹنے دو پہنچے کی گئی سی بنا کر بڑی کے لکھنی سے میری قیفی اور پتوں پر بخچنے میں شغول ہو گئی۔

تم رہنے والے — ”میر سے گئے الہوالے۔“

کوئی بات نہیں تھی۔ میرا دوپہر گندہ ہے۔

لئی تو یہ کہہ رہا ہوں — گندہ ہے رہنے والے میرے ایسا بھوپالے۔

وہ طو بھوٹھکی۔ مجھے کی کوشش میں اس نے ابو کی جانب دیکھا اور بھراز مرنو پھر کی کی ٹھرت چاہیں۔

ٹان گھوم کر سکھانے میں معروف ہو گئی۔

لکھو کی آنکھیں معا مقابلہ کی اٹکھوں جیسی بھی بھی پیشیوں نکلے پڑھی ہوئی آنکھیں تھیں — کچھ

خوابیدہ سی، کچھ محتاج بھی — اداں ہوتے ہوئے ذرا ذرا مکر پڑنے والی آنکھیں مجھے ان آنکھوں کو تریب سے دیکھنے کی ایسی شدید تنہا سامنا کرنے پڑا کہ میں پوش پوش کرتا پڑتے ہوئے میں بھاگ گیا۔

اس عمری محبت میں انسان بہت زیادہ پُر اعتماد ہوتا ہے۔ اس اعتماد کی کیفیت اس لگبڑی بحری بوقت سے مشابہ ہے جس کا کارک ابھی کھولنا نہ گیا ہو۔ ساری تھروں فقط احساسِ لذت سے بہزی ہوتی ہے زندہ رہنے کا احساس، اسی کو شدت سے چھیننے کا احساس، سارا احوال، خوب، باقی انہیں پر زم دکھان دینے لگتی ہیں۔ اچانک آنکھوں کے آگے ایک زم لنز لگ جاتا ہے اور بر پھر ہر لمحہ محبوب کی شکل اختیار کر کے کھٹ سے آنکھوں کے آگے آ جاتا ہے۔ پہلے ہی دن جب میں کھانا کھائے بیٹر میز سے اٹھا یا تو ٹکلو میرت کو دے میں آئی۔ نہ جانے وہ عمر میں مجھ سے بڑی خی کہ تپٹی۔ بہر کیف قدم دنوں کا برابر تھا۔

”اپ کا کھانا یہاں لا دوں جی — صاحب جی۔“

جب طرح کچھ لوگ غسلی کھانے کے بعد دو دھپنے سے ڈرتے ہیں میں اسی طرح ام کی محبت سے آشنا ہو کر اس کے وجود سے غوف کھانے لگتا تھا۔ میں نے آہستہ سے غنی میں سر لیا دیا۔ ”خانماں مجھے ناراضی ہو رہے ہیں — لا دوں جی کھانا؟“

میں نے احمد پن سے کاکدو کی کتابیں چھپاتے ہوئے کہا: ”مجھے بیوی نہیں ہے دو جی — مجھے ناراضی ہو رہے ہیں خانماں۔“

”اچھا لے آؤ۔“

گلوکر سے میں آتی تو میں چونکیں جائز کی طرح اپنا سارا بوجھ پہنون پر محسوں نہ رہا۔ نہ چل جاتی تو میں دیر تک اس خواہش کو دباتا رہتا جو مجھے اس کے تیچھے جلنے پر اکساتی رہتی تھی۔ مری میں میری امی اپنی صحت کو درغذانے کے لئے بہت جتنی کرہی تھیں۔ داکڑوں کے بل ادا کرنے، کمیشوں کی دکانوں کے چکر کلتے نہ اور اپنے نظاہر زندگی پر تاسف کرنے میں ان کے دن بسرا ہوتے تھے۔ میں سارا دن اس

قلمی آم کی طرح جو پھوس لپٹا پ جلنے کی راہ دیکھ رہا ہوا نذری اندھی شیخہ رس سے بھرا جا رہا تھا میرا زنگ زر دادر میرے ہاتھ پر بیٹھنے لگئے تھے۔ اس کی آبست پاکر ہمیشہ میری آنکھوں میں آنسو آ جلتے۔ میں اس ایساں پیٹھی کی طرح تھا جو ابھی اسیل ہر فنگے کی غمراونہ پیٹھا ہوا درخواہ مخواہ لڑنے کی آرزو میں مرا با تاہم۔

یہ دن یہ راتیں عجیب طرح بسر ہوئیں۔

نویں جماعت کا پلاشتی — مون سون بارش کا پسدار یا۔ زگ کے ڈنٹل میں اونیں پھول، میختے کے منہ میں دودھ کی پھلی دھار۔

گلوبریسے کی جہاندار ہیں تھی۔ اس کے میرے دریانِ لامد و فاسکے تھے اور سب سے بڑا فامبلہ اس جہاب کا تھا جو قدرتی طور پر مرد میں ہمیشہ ہوتا ہے۔ میں چب پاپ ڈم سادھے جاتا بھد کی آنکھیں دیکھتا رہتا اور میرے منے کبھی کوئی بات نہ لکھتی۔ میں بندوق کی بلبی پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا اور بندوق رانے کی ہمت نہ تھی۔

بچھڑا چانک ایک دن اس بلبی پر بوجھ پر ملکیا آپ آپ۔

میں امی کے مرے میں کبھی نہ جاتا تھا لیکن اس روز میں باخوبی سالٹ یعنی امی کے کمرے میں گیا تو میں دروازے میں ھمراہ گیا۔ گھوڑی نکل ٹیکن کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر گھرے رنگ زنگ کی پٹ سکت تھی اور دو اسی وقت امی کی ایک لمبی سی مالا پسند کے علی میں تھی۔ یہ لمبی سفید مالا امی کبھی کھالد سنکلکا فیروزی سارٹھی کے ساتھ پہننا کرتی تھیں۔ اسی مالا کے تینے بڑا سا فیروزی لاکٹ لشکا ہوتا۔ اس کا چھرو سفید پڑ گیا اور وہ یوں بھرا جائی بیسے جھاڑ بندھیتے پکڑی گئی ہو۔ وہ دوپٹے سے پٹ سک پوچھتی نیزی طرف بڑھائی:

”صاحب جی خدا کی قسم جی..... میں جی صرف دیکھ رہی تھی یہ ہا۔..... خدا قسم جی بیں نے بگیکم صاحب کی کوئی چیز نہیں چلائی۔ آپ کوارٹھیل کر دیکھ لیں جی..... آئیں جی میرے ساتھ۔“ میرے منے کوئی لفظ نہ لکھتا تھا۔ میں صرف اس کے چہرے کو ہمت رہا تھا۔ ہونٹوں سے اتری

بُونی اپ شک کو گھوڑہ تنا اور وہ ہاتھ جوڑ سے کھو دی تھی۔

”میں چور نہیں ہوں جی۔ بھائی مجھے جان سے ارادے گا۔۔۔۔ میں چور نہیں ہوں صاحب جی۔“

میں بھل کے کہبے سا گڑا رہا تو وہ نیکم میرے پریوں میں یہیں بھلا کر بیٹھ گئی۔ ھٹھ سے فرد زے کا ماکٹ میرے بوٹے سے جانکرا یا اور اس کے دونوں ہاتھ میرے تک موٹ سے چپک گئے۔

”خدا کے لئے جی مجھے معاف کر دیں۔۔۔۔ میں جی۔۔۔۔ چور نہیں ہوں۔ آپ کو اڑپیں جا

کرو دیجئے لیں۔“

پتہ نہیں کہ لوگوں سے عمر میں بڑی تھی کہ تھوٹی، ہبہ کیف قدح میں دونوں کا برا رتحا۔

جب میں نے اسے کندھوں سے کپڑا رکھایا تو میری انگلیوں کا بوجھا اس پر اتنا ہلاکا قابصیے دن ہوا تھا اور مجنی لیٹی ہوئی ستی نئی اور مجھے خوف تھا کہ اسے چھوٹتے ہی اس کے پریوں کا انگلے میرے انگلیوں پر اترانے گا۔

اس کے سانس میں بوہل کی خوشبو تھی۔

”مجھے معاف کر دیں۔ میں چور نہیں ہوں جی۔“

”یہ ملامت پتے گا مذل لے جانا۔“

میں جی۔۔۔ یہ ملا۔۔۔ اس نے منگی میں لاکٹ بیٹھنے لیا۔

اس کا چہرہ حیرانی، خوشی ”جا تجوہا“ قسم کے جذبات سے گلداری ہو لیا۔

”پکی۔۔۔ لے لوں میں۔۔۔“

”ہاں۔۔۔ پکی۔۔۔ بھیث کے لئے۔۔۔“

سفید بوتوں کو اپنی انگلیوں سے بوئے دیتی وہ بھاگ گئی اور میں وہیں گھردار رہا۔

یہ میرا اور گھوڑہ کارڈان تھا۔۔۔ اسے میں نے اس نے تفصیل سے بیان کر دیا ہے تاکہ وہ

ازام آپ کی سمجھیں آسکے جو سارے مجھ پر لگا یا۔

گھوڑے پر نظر آئی۔ شاہ کو اس کا بھل بہانہ مارڈیوں پر موجود تھا اور وہ واپس ہزار سے جا

پچھی تھی۔

میرے دل کے آہو سی فرش پر نو عزیز نواری کے پیر دل کے گیلے شان پڑنے اور پھر روزہ روزہ کی زندگی لئے گرم بہابن کر جات گئی۔

میں اس دل قصے کیجاں اسی اذیت پسند ہو گیا کہ پھر کبھی کسی رُلی کے فریب ہونے یا کسی رُلی کو اپنے قریب کرنے کا وظہ نہ پڑا۔ یوں سایہِ زلفِ بمان سے بھاگتا میں بُرنسَنی پارادیواری میں مجھوں بُرنسَنی دوست کو میں سے والد نے جس پسندید سے جمع کرنا شروع کی تھا میں نے اس کی رفتار میں رکاوٹ کی قوت سو دی۔ میں راجہ بیا داس بن گیا۔ جس پھر کو ہاتھ رکھتا سوئے فی بن جاتی۔ میرے بلور پڑت، میرے پان میں سکھوں دو دوست کی بد عالک پتی تھی۔ میں گھٹائے ہو دے کرتا اور دو صندوق کی صورت میں جو بیک اوت آتے۔ خدا جلنے میرے پاس دہ مشین کمان سے آگئی تھی جو ہر لمحہ سونا الگتی تھی اور پور کی طرف میری ہر سیکنڈ امیاب اور سونے میں تخت تھی۔ — میں کامیابی کا سabil، خوش بختی کا آیندہ لیل وہ ترقی کی مسراج تھا۔

یہ اس وقت کا واقعہ ہے بہب مگی ڈیڈی کی وفات کے بعد میں پتی باریو پ گیا۔  
بہاں میں ملاقات موہر لینڈ کی پڑھی ہوئی سارے ہوئے — سارا کام والد میرے متبرکہ پاپ کی طرح بست ایسا آدمی تھا اور اس نے سارا اپنی الگوں بن اال کی۔ میں کوہبت لادی سے پالا تھا۔ وہ پہنچا کوہیش انگریزی میں سختی تھی اور اپنے کے ساتھ ختم کرنی تھی جس کی طرح باہم میں حضرت اعلیٰ کی بیوی کا نام لکھا ہوتا ہے۔

ہماری شادی کرائی کے آئیں ایسے ہوٹل میں ہرجن جس کی افسیں کھلاخت سات مردیں پہنچتی تھیں۔ فیضن ایبل مسالوں میں پیپس اور ہم، سنی ہون منانے ہوئے پڑ گئے۔

آئائش کے بٹ: ذہن میں پڑے ہوئے دگنی پر

شادی کی پتی رات بہب میں ہوئے ہے تیر داخل ہوا تو میری دہن ذری دار انسٹی پسے پنگ پر

اوہ بھی بیٹھی تھی۔ کے سے ماذ تھا داش، سپرت اور ایر فرنسز کی مل جل خوشبو آر بی تھی۔ پتہ نہیں کیوں  
امی یاد آئیں۔ آنکھ کی جھری سے اس نے میری جانب دیکھ کر کہا:  
اکیکیوزی — میری عقل دار حلقہ می ہے۔ الجی ڈاکٹر دیکھ کر گیا ہے  
نمایت فیر دماغی طریقے سے میں نے اس کا نہ کھولا اور عقل دار حلقہ کی چولی ہونی تکی مارچ کر  
روشنی میں دیکھی۔

یہ ساری رات سارا باہمے اٹھے کرنی رہی اور میں اس کی تیمار داری کرتا رہا۔

ہنی مون شادی شدہ جوہنے پر معاشرے ہے سب سے بڑا ظلم ہے۔ دو انسان ہمارا کٹ کی یہی تیزی  
سے ایک دوسرے کی طرف بڑھ رہے ہوں انہیں برا برا تحریک کیا تو غیب دینا شکست و رینگت کی داستان  
مرتب کرنے کے سوا اور کچھ نہیں، شروع شادی میں اپنیں شادی کو سیقیں کرنی ہیں۔ ملک آزادی سے  
اس منشک نافے کی خوشبو پیچ کرنا بابت ہو جاتا ہے۔ ایسے طریقے سے ہماری ہنی مون بھی برجنی ملن کی لڑاج  
پھٹے بنتے میں ہی نیل ہو گیا اور ہم اسے وہ باکس آٹھ ہٹ نہ بنائے جس کی توقع کے کہ ہم دونوں  
ہوں گے تھے۔

مجھے سارا کی ہربات سے اتفاق نہ تھا اور نہ بدلنے والے کیوں سمجھتی تھی کہ اہم اخن نہ کر کے میں اس کے  
ساتھ مجت کے فقیہان کا ثبوت جو ہمپاڑ ہا ہوں۔ اسی نے ہم نے مجت کرنے کا ایک ایسا اسوب ایجاد  
دیا جس میں نعلیٰ اذیت دینے اور اس اذیت سے حفظ الحلال کی قوت تھی۔ جو نی بیان کی اکتوبر سارا باب  
ل لاڈلی، دولت کن پر درد دی جیسوس کرتی کہ میں اس کی طرف متوجہ نہیں اور ہماری ہاتوں کا سماں ختم ہو  
لے ہے۔ وہ میرے پاس گرہ بانی سے آتی۔ اس کے تم سے خالی کراس کی آسٹینز کے قریب سے نیم  
کے گیکے ہاتوں کی خوشبو ایسا کرتی تھی۔ اسی نئے اسے ہر قسم کے DEODORANTS میں عشق تھا۔ وہ  
بھپر جھک کر انہیں یہیں پوچھتی:

اپس کے خیالوں کے نے آیا ہیں —  
میں چھپ رہتا۔